خاموشی

قبرستان، جنہیں شہرِ خاموشاں بھی کہا جاتا ہے، ہماری زندگی کا حصہ ہیں۔ ہماری کہانی کا انجام۔ جیسے زندگی کے دوسرے رنگ ذات کے کینوس پر مصوری کرتے ہیں، ویسے ہی ہر گاؤں، ہر قصبے اور ہر شہر میں قبرستان بھی عبرت کی چھابڑی لگائے کسی نہ کسی گلی یا سڑک پر بکھرے رہتے ہیں۔ شہادت کا کلمہ پڑھتے لوگ مر جانے والوں کو کندھوں پر اٹھائے آتے ہیں اور زمین کے سپرد کر کے چلے جاتے ہیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ تو یہاں کبھی آئیں گے نہیں۔ عبرت بھی اللہ کی توفیق ہے۔ جسے چاہے دے اور جسے چاہے نہ دے۔

میرا گاؤں جھاوریاں دریائے جہلم کے قریب واقع ہے۔ اس کا قبرستان سیلاب کے رستے پر آباد ہے۔ جب بھی سیلاب آتا ہے نہ جانے اس قبرستان سے کیا لے جاتا ہے اور کیا چھوڑ جاتا ہے۔ لوگ پھر اپنے پیاروں سے اس کی زمین کو سیراب کرنے لگتے ہیں۔ جھاوریاں سے کچھ فاصلے پر کالرہ کا گاؤں ہے۔ وہاں ایک ''وی آئی پی'' قبرستان ہے۔ یعنی شہرِ خاموشاں کی جیتی جاگتی تصویر۔ جب سے ہوش

سنبھالا، میں نے اس قبرستان میں کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔ اَب تو وہاں کوئی مر کر بھی نہیں جاتا۔ کچھ اور آگے آئیں تو پنڈی کا چھوٹا سا گاؤں ہے۔ سڑک اس قبرستان کے بیچوں بیچ گزرتی ہے۔ ایک چھوٹی سی مسجد، چند قبریں اور ون کے درخت۔ ان تینوں قبرستانوں کو ایک سڑک مالا کے دانوں کی مانند پروتی ہوئی سرگودھا شہر کی طرف رواں دواں ہے۔ ہانپتے اور پسینے سے شرابور انسانوں سے لدی بسیں ہوں یا گنے کے بوجھ تلے کراہتے ٹریکٹر ٹرالی، سڑک پر سانپ کی طرح سنسناتے موٹر سائیکل ہوں یا موت کو دعوت دیتے سائیکل سوار، مویشی، انسان سب اس سڑک پر دن بھر یہاں سے وہاں دندناتے پھرتے ہیں۔ لیکن جب رات ہوتی ہے تو کہانی بھی بدل جاتی ہے۔

تو ہوا یوں کہ ایک دن میں کام سے جھاوریاں گیا۔ مصروفیات کی وجہ سے دیر ہوگئی اور نکلتے نکلتے رات کے دس بج گئے۔ سب نے کہا کہ وقت اکیلے سفر کرنے کا نہیں۔ جب لکھا ہو تو کون ٹالے۔ YAMAHA-80 ہوا کرتا تھا میرے پاس۔ پٹرول چیک کیا۔ بتی اور اشارے جلا بجھا کر دیکھے۔ سب ٹھیک کام کر رہے تھے۔ گھر والوں سے اجازت لے کر اللہ کا نام لیا اور سرگودھا کی طرف روانہ ہوا۔ سرگودھا جھاوریاں سے کوئی پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بس نکل پڑا اور بھول گیا کہ مستقبل میں تو کوئی روشنی جھانک نہیں سکتی میری بیچاری موٹر سائیکل کی بتی کیا جھانکتی۔

جھاوریاں سے نکلا تو تھوڑی ہی دیر میں کالرہ پہنچ گیا۔ کالرہ کا قبرستان ہمیشہ کی

طرح اکیلا بیٹھا تھا۔ اَب تو اس سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ ہوا کے دلفریب تھپیڑے چہرے اور جسم کو سہلا رہے تھے۔ چاند گھنے بادلوں کے پیچھے روپوش تھا اور سڑک پر روشنی کا کوئی انتظام بھی نہ تھا۔ لیکن راستے کا تعین کرنے کے لیے موٹر سائیکل کی روشنی بہت تھی۔ کالرہ گزر گیا اور کچھ دور بل کھاتی سڑک نظر آنے لگی جسے پنڈی کے قبرستان کے بیچوں بیچ سے گزر کر جانا تھا۔ میں یہاں سے ہزار بار گزرا تھا۔ عادت تھی۔ سو ہوا کے تھپیڑوں کا لطف اٹھاتا چلتا گیا۔ رفتار میں نے کم ہی رکھی تھی کیونکہ رات کا وقت تھا اور سڑک کا حال بھی پتلا تھا۔

پنڈی کا قبرستان اَب قریب آ چکا تھا۔ قبرستان میں لگے وَن کے درخت کی ایک بہت خاص بات ہے۔ اس کی مسواک بہت عمدہ ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو؟ اس کے نیچے Potassium, Calcium, Carbon اور نجانے کن کن معدنیات کے انبار لگے رہتے ہیں۔ اس کی جڑھیں ان خزانوں سے رس چوستی ہیں اور پھر زندہ انسانوں کے دانتوں کو جِلا بخشتی ہیں۔ کائنات میں کچھ بھی رائیگاں نہیں جاتا، مٹی کا پتلا بھی نہیں۔ قبرستان اَب اور قریب آ گیا اور دھندلکے میں اس کی اندھیری مسجد، قبروں کے مدھم نشان اور خاموش کھڑے وَن کے درخت نظر آنے لگے۔ کچھ ایمان باقی تھا شاید اس لیے ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر سی دوڑ گئی۔ جھٹ سے ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھا اور بڑھتا چلا گیا۔ جیسے ہی مسجد کے سامنے پہنچا تو دودھما کے ہوئے۔ موٹر سائیکل بری طرح سے ڈول گیا۔ قریب تھا کہ میں اپنا توازن کھو دیتا لیکن جیسے تیسے بغیر گرے میں موٹر سائیکل روکنے میں کامیاب رہا۔ کچھ لمحے تو حواس

باختہ رہا پھر غور سے سڑک پر دیکھا تو وجہ معلوم ہوئی۔ کسی نے سڑک پر کیل پھینک رکھے تھے یا پھر حادثاتی طور پر گر گئے ہونگے۔ لیکن اس دانستہ یا حادثاتی غلطی نے میرے موٹر سائیکل کے دونوں ٹائر بیک وقت ناکارہ کر دیئے تھے۔ اَب جب حرکت رکی تو ہر چیز ساکن ہوگئی اور ایک ارتعاش زدہ سکوت طاری ہوگیا۔ فیصلے کی گھڑی آن پہنچی۔ اَب کیا کرنا تھا؟ اگلا قصبہ لک موڑ تو بہت دور تھا اور جھاوریاں بھی کافی فاصلے پر تھا۔ قریب ترین گاؤں کالرہ ہی تھا اس لیے سوچا کہ واپس کالرہ چلا جاؤں اور کوشش کروں کہ اس مشکل کا کوئی مداوا ہو۔ کالرہ بھی کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا جو اتنا زیادہ نہ تھا۔ اپنے اردگرد دیکھا تو جیسے اتھاہ سمندر کے بیچوں بیچ اپنے آپ کو کھڑا پایا۔ اندھیرا آسمان، اندھیری زمین اور درختوں کی شکل میں تن کر کھڑے خاموش تماشائی۔ ان کے عین درمیان میں موٹر سائیکل کے پسٹن کی دل کی دھڑکن جیسی آواز، تاریکی کی چادر میں ہلکا سا رخنہ ڈالتی موٹر سائیکل کی بتی اور شش و پنج کی تصویر۔ میں۔

یہ علاقہ زیادہ تر زرعی زمین پر مشتمل ہے۔ مزارعوں کے ڈیرے ہیں لیکن بہت فاصلے پر۔ زیادہ تر زمین پر فصل اگی ہے یا سرکنڈے لگے ہیں۔ اندھیرا ان قدرتی نعمتوں کو ویرانی میں بدل دیتا ہے۔ رات کے اس پہر یا تو یہاں مزارعوں کے کتے دندناتے پھرتے ہیں یا آوارہ کتے اپنی حدود کا تعین کرنے کی سعی میں مشغول رہتے ہیں۔ ان کو کسی بھی قسم کا اجنبی پسند نہیں۔ کتوں کی ان دونوں نسلوں کے معاشرتی اقدار انتہائی مشکوک ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سے نرمی یا ہمدردی کی توقع رکھنا کسی

دیوانے کا خواب ہی ہوسکتا ہے۔ زیادہ تر رات کے اس پہر یہ بھونکتے کم اور کاٹتے زیادہ ہیں۔لیکن آپ کی طرف بڑھتے ہوئے اس خوفناک آواز سے دوسرے کتوں کو متوجہ کرنے کے لیے بھونکتے ہیں کہ دل سینہ پھاڑ کر باہر لپکنے لگتا ہے۔ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی میں کھڑا ہوا، ماحول کا افریت میری تلاش میں سرگرداں ہوگیا۔ ہر ممکنہ سمت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ان کے منہ سے نکلنے والی جھاگ ان کے بھونکنے میں حرص کا جوعنصر پیدا کر رہی تھی اسے میں اس دوری پر بھی محسوس کرسکتا تھا۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں نے بس جلدی سے موٹر سائیکل بند کر دیا اور بتی بجھادی کہ شاید خاموشی سے مایوس ہوکر واپس چلے جائیں۔ یہ کرنے سے یکدم میرے اردگرد قبر کا سا اندھیرا ہوگیا۔ چاند کا آسرا تو پہلے ہی نہ تھا۔ روشنی کی ایک کرن تھی جو میں نے بجھا دی۔خوشگوار ہوا کے جھونکے جو پہلے میرے چہرے کو سہلا رہے تھے، پہلے خاموش ہوئے اور پھر ان سنی آوازوں میں بدل گئے۔

زندگی کا چکر بھی عجیب ہے۔ جب شور مچا ہو تو بہت سی آوازیں اس شور میں گم ہو جاتی ہیں اور سنائی نہیں دیتیں۔خاص طور پر وہ آوازیں جو ہم سننا نہیں چاہتے۔ یہ کہنا کہ خاموشی ہے اس سے بڑا تو کوئی جھوٹ نہیں۔ دنیا میں کبھی خاموشی نہیں ہوتی۔ جب تک سانس چلتی ہے خاموشی نہیں ہوتی۔فرق صرف یہ ہے کہ باہر کا شور ختم ہوتے ہی اندر بپا ہیجان جاگ اٹھتا ہے۔ پھر وہ آوازیں آتی ہیں جنہیں کان نہیں سن پاتے پر روح کو سنائی دیتی ہیں جیسے دل کی دھڑکن، سانس کا چلنا، آپ کے ذہن میں ہمیشہ

سے خاموشی کی چادر اوڑھے وہم، وسوسے اور ڈر، وہ آوازیں جو آپ ہزار بار سنتے ہیں اور ان سنی کر دیتے ہیں۔ خاموشی کی چادر پھیلتے ہی یہ سب آوازیں ایک وحشتناک حد تک چلانے لگتی ہیں۔ یہی ہوا۔ کتوں کی میری طرف بڑھتی ہوئی آوازیں، بچپن سے لے کر اُس لمحے تک سنے ہوئے ڈراؤنے قصے، جادو کی کہانیاں، جنوں بھوتوں کے وسوسے اور اپنے ہی ڈر کی تخلیق کردہ صدائیں سب میرے اردگرد جمع ہونے لگیں۔

ہمیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ گھر، چار دیواری، اپنے پیارے، دوست یار یا محض دوسرے انسان کا وجود ہمیں کتنی اندوہناک خاموش صداؤں سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایک تو تنہائی، گھپ اندھیرا اور تیزی سے رخ بدلتی آوازیں۔ ایک لمحے کو تو مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میں قبرستان کے بیچ میں کھڑا ہوں۔ مجھے ہوا نے یاد دلایا۔

ون کا درخت جیسے قبرستان کے لیے ہی بنا ہے۔ اس کا تنا شریانوں کی مانند لچھے دار اور اس کی ٹہنیاں آپس میں خلط ملط ہوتے نقوش کی مانند ہوتی ہیں۔ اس کے پتے چھوٹے لیکن گھنے ہوتے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے پتوں کی گھنی بانسری سے جب ہوا چھن کر گزرتی ہے تو ایک سسکی جیسی آواز آتی ہے۔ ہمیں عام طور پر یہ سنائی نہیں دیتی۔ لیکن جب تنہائی ہو، اندھیرا ہو اور کوئی آواز بھی نہ ہو تو سسکیوں کی یہ آوازیں زور پکڑ جاتی ہیں۔ مجھے جیسے ہی ان سسکیوں کی آواز آئی تو میں نے اپنے

ماحول کو سمجھنے کے لیے غور سے قبرستان کی طرف دیکھا۔ غلطی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ عقلی تقاضا تو یہ تھا کہ غور وخوض کی بجائے مجھے موٹر سائیکل موڑ کر واپس چل دینا چاہیے تھا۔ لیکن خیر لکھے کو کون ٹالے۔

میں نے جب غور سے اندھیرے میں جھانکا تو دور ایک قبر پر ایک چھوٹے سے شعلے کو ناچتے دیکھا۔ دیا ہوگا، کوئی رکھ گیا ہوگا۔ دیا بھی کیا چیز ہے۔ ایک ہلکا سا شعلہ ہے جو دھاگے کی ایک کنی پر محو رقص رہتا ہے۔ چونکہ بہت چھوٹا ہے اس لیے محض ارتعاش پر بھی ناچتا ہے۔ ہاں جب اندھیرا گہرا ہو تو اس چھوٹے سے شعلے کے سائے بہت لمبے ہوتے ہیں۔ اَب جب غور کیا تو وہ تھرکتا شعلہ ان درختوں کے سایوں میں تبدیل ہو گیا۔ خاموش اور پرسکون درخت اس کی لے پر ہلکے ہلکے سے جھومنے لگے۔

بے جا غور نہیں کرنا چاہیے۔ شاید زندگی کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ راہ میں اگر کیل پڑے ہوں اور موٹر سائیکل کے ٹائر پنکچر ہو جائیں تو بس منزل اور منزل کو جاتی سمت کا تعین کر لیں۔ شاید کبھی آپ کو موٹر سائیکل چھوڑ کر جانا پڑے یا ساتھ ساتھ گھسیٹنا پڑے، کسی بھی صورت میں زندگی کی حرکت کو نہ رکنے دیں۔ جائے حادثہ کو جائے حادثہ سمجھ کر پیچھے چھوڑ جائیں۔ وہاں رہ کر وجوہات یا نتائج کی بحث میں مت پڑیں کیونکہ جب آپ اس خرابی کے لمحے پر غور کرتے ہیں تو اس کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ اور آپ کو اس جگہ کے ابلیس سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ہاں اگر آپ اپنا سفر جاری رکھیں تو اس صورت میں اس جگہ کا افریت آپ کو ڈرا نہیں سکتا، پیچھے رہ جاتا ہے۔ میں

اَب اس اندھیرے کے افریت کا قیدی ہو چلا تھا۔ میرے اندر کے وہموں اور وسوسوں نے بھی میرا ساتھ نہ دیا اور لگے جھومنے۔ یہی کیا کم تھا۔نظر جھکا کر دیکھا تو کسی کی قبر پر کھڑا تھا۔

انسان کمال کی چیز ہے۔ دھرتی پر چلتا پھرتا ہوتو سرمایہ حیات، عشق کی معراج اور قندیلِ زندگی۔ ہاں اگر زمین کے نیچے چلا جائے تو اس کی نشانی سے بھی ڈر لگتا ہے۔آپ کا کوئی بہت پیارا جب خدا کو پیارا ہو جائے اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں جا بسے تو ایسا پرایا ہوتا ہے کہ اگر خواب میں آئے تو وہم اٹھتے ہیں، یاد آئے تو رلا دیتا ہے، اس کی تصویر دیکھو تو ماضی حال پر مسلط ہونے لگتا ہے۔ ہم زمین کے ان باسیوں سے بس کنارہ چاہتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہم زندگی میں دوسروں کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کرتے، کیسی کیسی قربانیاں نہیں دیتے، کہاں کہاں ذات کی نفی برداشت نہیں کرتے، کب کب بے توجیہی کی اذیت سے نہیں گزرتے کہ دوسرے خوش رہ سکیں، آپ کو سمجھ سکیں۔ لیکن ایک دفعہ اگر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں تو آپ کی یاد، تصویر، خواب، نشانی سب کچھ نشانِ عبرت بن جاتا ہے۔ ہمارا دنیا سے بس اتنا سا ہی تعلق ہے۔ سمجھ آ جائے تو اچھی بات ہے اور نہ سمجھ آئے تو بھی چلتا ہے۔

اپنے آپ کو قبر پر کھڑا دیکھ کر میں بدک کر پیچھے ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے اندھیرے میں کچھ دیکھا ہو۔ کچھ تو حرکت میں تھا۔ سانپ بچھو، یا..... اور اس

''یا'' نے میرے حواس باختہ کر دیئے۔ سر کے پچھلے حصے سے یخ بستہ لہر اٹھی اور پاؤں جہاں تھے وہیں جم گئے۔ درختوں کا رقص وجدانی ہو گیا۔ قبریں اور پیڑ یک جان ہو گئے اور سسکیاں آہوں اور چیخوں میں بدل گئیں۔ کتوں کی آوازیں بھی اَب نزدیک آ چکی تھیں۔ میں نے چیخنا چاہا تو چیخ نہ سکا۔ آواز گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ ایسے میں میرے عین عقب میں کوئی حرکت ہوئی۔ پتے چٹخے اور کوئی مدھم قدموں سے میری طرف بڑھنے لگا۔ میرا تو خون خشک ہو گیا۔ دور میری موٹر سائیکل کسی لاوارث لاش کی مانند اوندھے منہ پڑی تھی اور صدیوں کا فاصلہ تھا۔ اس وقت اس لمحے کون ہو سکتا ہے؟ خدا کرے کہ کوئی انسان ہو۔ لیکن انسان اس وقت یہاں کیوں آئے گا؟ تو پھر کون؟ اَب پتے تواتر کے ساتھ چٹخنے لگے۔ میں نے اضطراب میں اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی لکڑی اپنی حفاظت کے لیے اٹھا لوں لیکن کچھ نہ ملا۔ قبریں اَب خاموش تھیں اور ان کا اندھیرا ان کے اندر سے نکل کر باہر پھیل گیا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ چارو ناچار پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا تو جسم شل ہو گیا۔ اپنی ہمت بندھائی، چار قل پڑھے اور اللہ کا نام لے کر مڑا۔ قبرستان کے کنارے پر ایک ہیولا اپنے قدم گنتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ یکدم سب آوازیں خاموش ہو گئیں۔ اَب صرف پتوں کے جوڑ ٹوٹنے اور میرے دل کی دھڑکن کی صدائیں آ رہی تھیں۔ ہیولا میری طرف بڑھتا رہا، سیاہ، بے شکل، بے وضع اور خاموش۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میری طرح کا کوئی انسان ہو گا۔ لیکن اس کی بے ہنگم دھویں جیسی وضع میری سب دلیلوں کی نفی کرتی تھی۔ میں جامد کھڑا رہا اور وہ میری طرف بڑھتا رہا۔ مجھے اپنے

عقب میں ٹہنی ٹوٹنے کی آواز آئی تو میں نے بدک کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی نہ تھا۔ واپس مڑا تو وہ افریت میرے سامنے کھڑا تھا۔ عنقریب میں بھی ان پتھرائی ہوئی لاشوں میں شامل ہونے کو تھا۔ وہ ایک قدم بڑھا اور پھر دوسرا اور پھر تیسرا اور میرے وجود سے ہوا کی مانند گزر گیا۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسے لگا جیسے میری روح قبض کر لی گئی ہو۔ میں اپنے رہے سہے سانس سمیٹنے کی سعی کرنے لگا۔ میں گھبرا کر مڑا تو وہ اسی موت کی سی خاموشی کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے سر کے عین اوپر وَن کے درخت کے پتوں نے پہلے سسکی اور پھر آخری ہچکی لی۔ اَب کے جب وہ ہیولا مڑا تو اس کے چہرے میں دو انگارے دہک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں مگر باقی چہرہ ویسے ہی ویران تھا۔ پھر وہ بڑا ہونے لگا، بہت بڑا، پہاڑ سے بھی بڑا۔ اس کی آنکھیں شعلوں کے عقب سے مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو موت کے لیے آمادہ کر لیا۔ یکدم وہ افریت اتنی دور سے چیخا کہ زمین دہل گئی۔ میرے تو جیسے کانوں کے پردے پھٹ گئے۔ اس کی دلدوز چیخوں نے بالآخر میرے گلے کا بند بھی توڑ دیا اور میں بھی اسی زور سے چلانے لگا۔ اَب وہ افریت اپنی تمام تر رعونت اور وحشت کے ساتھ میری طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کا خون اگلتا منہ اور شعلہ اگلتی آنکھیں مجھے اپنے اندر سمیٹ لینے کو بے تاب تھیں۔ میں بے جان مجسمے کی طرح بے بسی سے اپنی موت کو اپنی طرف بڑھتا دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر سکا۔ اس بار وہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جب منہ کھولا تو مجھے اس کے گلے کے پار دوزخ نظر آیا۔ اس کا منہ کھلتا گیا۔ ایک لمحے میں مَیں زندہ درگور ہونے کو تھا کہ آسمان پھٹا، اندھیرے کی چادر نور

کی ایک کرن نے تار تار کر دی اور دوسرے ہی لمحے میں روشنی میں نہا گیا۔

ذہنی طور پر موت کو قبول کرنے کے بعد میں کسی معجزے کا منتظر تو نہ تھا لیکن اس نور کی بارش نے میرے گھٹنوں سے رہی سہی جان بھی کھینچ لی۔ میں بے بسی سے گھٹنوں کے بل زمین بوس ہوا۔ روشنی کا ریلا مجھ پر منجمد تھا۔ ہمت کر کے اس نور کے منبع کی طرف دیکھا تو ایک ٹریکٹر ٹرالی کی بڑی بڑی بتیاں نظر آئیں۔ جو ابھی آہستہ آہستہ قبرستان کی بل کھاتی سڑک پر موڑ کاٹ رہا تھا۔ میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں، میں بس یہی چلاتا اس ٹریکٹر کی طرف بھاگا۔ مجھے دیکھ کر ڈرائیور نے ٹریکٹر روک لیا اور میرا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ میں نے اپنے حواس سنبھالے اور اس سے اس کی منزل کا پتا پوچھا۔ اس کے منہ سے جھاوریاں کا لفظ سن کر میری جان میں جان آئی۔ موٹر سائیکل ٹرالی کے پچھلے حصے میں رکھ کر ٹریکٹر پر چڑھنے سے پہلے میں نے مڑ کر قبرستان کی طرف دیکھا تو وہاں صرف خاموشی تھی۔